نوٹ فار دی ریکارڈ

جولائی 5، 2010ء

شعیب سلطان خان

گلگت، جولائی 5، 2010ء

عنوان: **سانحہ عطاء آباد**

آغا خان رورل سپورٹ پروگرام پر عملدر آمد کے سلسلے میں گلگت بلتستان اور چترال میں 12 سال کے قیام کی وجہ سے مجھے ان علاقہ جات کے لوگوں کے ساتھ ایک خاص تعلق خاطر قائم ہو چکا ہے۔ چنانچہ جب مجھے انٹرنیٹ کے ذریعے عطاء آباد کے لوگوں پر پڑنے والے افتاد کا علم ہوا تو میرا دل ان کے لیے بے تاب ہو گیا۔ میری آرزو تھی کہ پاکستان واپسی پر میں عطاء آباد کے لوگوں کو پہنچنے والے رنج اور جذباتی صدمے پر ان کے تالیف قلب میں شریک ہو جاؤں۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ لینڈ سلائڈنگ اور سیلاب نے نہ صرف عطاء آباد کو متاثر کیا تھا بلکہ بلاواسطہ سرٹ، آئین آباد، ششکٹ، گلمت، غلکن پائین، حسینی اور یہاں تک کہ دور دراز واقع پاسو کو بھی متاثر کیا ہے جس میں مجموعی طور پر 381 گھرانے بشمول عطاء آباد اور سرٹ کے 147 گھرانوں کے، شامل ہیں۔ درحقیقت جملہ 19 اموات آئین آباد پائین میں ہوئی تھیں۔

سانحہ سے بلاواسطہ 1000 گھرانے اور 10,000 افراد متاثر ہوئے ہیں جبکہ بالواسطہ طور پر شاہراہِ قراقرام کے ڈوب جانے سے ہنزہ بالا (25,211 نفوس پر مشتمل گوجال کی پوری آبادی) اور وسطی ہنزہ میں رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ چین کے ساتھ تجارت جمود کا شکار ہو گئی ہے، جس سے بلاواسطہ اور بالواسطہ طور پر 6,000 لوگوں کا روزگار متاثر ہوا ہے 7 عدد سکول، 130 ہوٹل، دوکانیں اور کاروبار اور 3 عدد کمیونٹی سینٹرز سب کے سب زیرِ آب آ چکے ہیں۔ 400 ہیکٹر زیر لگی ہوئی کئی ملین روپوں کی آلو کی نقد آور فصل زیرِ آب آ چکی ہے۔ اور جو زیرِ آب نہیں آئی ان کے لیے ذرائع نقل وحمل کے نہ ہونے کی وجہ سے کوئی خریدار نہیں ہے۔ پچھلے 27 سالوں کے دوران پروان چڑھائے گئے پھلدار اور غیر پھلدار درخت بھی ضائع ہو چکے ہیں۔ صرف آئین آباد کے چھوٹے سے گاؤں میں 39,000 پھلدار درخت زیرِ آب آئے ہیں۔

علاقے کی معیشت تباہ ہو چکی ہے۔ دریں اثناء اس کے اثرات نشیبی علاقوں تک محسوس کیے گئے ہیں۔ گلگت سلطان آباد میں جب میں AKRSP کے ایک پرانے اہلکار تو الدشاہ سے ملنے گیا تو میں نے زمین پر گرے ہوئے ٹنوں کے حساب سے سیب دیکھے جو گل سڑ رہے تھے۔ عطاء آباد لینڈ سلائڈنگ کے خوفناک بند کے ٹوٹنے کے خدشے کی وجہ سے شہری علاقوں سے سیب کے خریدار گلگت کا رخ نہیں کر رہے ہیں۔ اس دردناک اور دل ہلا دینے والے پسِ منظر میں، میں امید کر رہا تھا کہ AKF کے ہیلی کاپٹرز عطاء آباد کے بدقسمت متاثرین کی مدد کرنے میں ہمہ وقت مصروف ہوں گے۔ جب میں نے انہیں درخواست کی کہ وہ اگلے چکر میں مجھے بھی اس علاقے میں لے جائیں تو اس پر ان کی عدم موجودگی سے مجھے سخت دھچکہ لگا۔ خوش قسمتی سے PIA کی فلائیٹس موجود تھیں اور میں گلگت پہنچ گیا۔ رائے کوٹ سے ہنزہ کے آگے تک شاہراہ قراقرم کا کم و بیش 600 کلومیٹر کا ٹکڑا چائینز نے کھودا ہوا ہے۔ اسلام آباد سے گلگت کا سفر بذریعہ جیپ اب بجائے 12 گھنٹوں کے 20 گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ گلگت سے ہنزہ تک پہنچنے میں جہاں زیادہ سے ڈیڑھ گھنٹہ لگتا تھا وہاں مجھے 4 گھنٹے لگے۔ سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ گلمت تک کیسے پہنچا جائے۔ درمیان میں جھیل پھیلی ہوئی تھی جس کی گہرائی گلمت کے پاس 136 فٹ تھی اور سرٹ کے پاس 376 فٹ۔ چھوٹی چھوٹی مقامی کشتیاں موجود تھیں جو لینڈ سلائیڈ سے گلمت تک پہنچانے میں ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ لگاتی ہیں۔ AKRSP کے ریجنل منیجر مظفر الدین اور ڈاکٹر شاہدہ جعفری جو کریم آباد ہنزہ سے میرے شریکِ سفر بنے، نے مختلف ترجیحات پر مجھ سے بحث کی۔ مظفر نے کشتی کے ذریعے سفر کرنے میں درپیش مضمرات سے ہمیں ڈرانے کی کوشش کی، شاہدہ اور میں نے غالب کے اس شعر کا سہارا لیا

"ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا

نہ کہیں جنازہ اٹھتا ، نہ کہیں مزار ہوتا"

خوش قسمتی سے نیشنل ڈزاسٹر منیجمنٹ اتھارٹی (NDMA) کے کرنل نیاز نے ہم پر ترس کھایا اور مظفر کی درخواست پر NDMA کے ہیلی کاپٹرز میں دونوں طرف پہنچایا۔ ایک چکر میں یہ صرف چند لوگوں کو پہنچا سکتا ہے جبکہ لوگ AKF کی مدد کے لیے چلا رہے تھے۔ مجھے مئی 1983 میں ہز ہائنس کا گلگت کا پہلا دورہ یاد آیا جب انہوں نے اس بات پر شدید تشویش ظاہر کی تھی کہ ہیلی کاپٹر شمالی علاقہ جات میں استعمال نہیں ہو رہے بلکہ اسلام آباد میں کھڑے ہیں۔ انہوں نے شدت کے ساتھ اس بات پر زور دیا تھا کہ اس مشین (ہیلی کاپٹر) کو استعمال میں لایا جائے۔ کیونکہ اگر یہ زمیں پر کھڑے رہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انکے پیسے ضائع ہو رہے ہیں۔ میرے خیال میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہز ہائنس کے یہ ارشادات، AKF کے ہیلی کاپٹر شعبہ کو چلانے والے اہلکاروں کے سامنے لائے جائیں۔ ہیلی کاپٹرز کے استعمال کے سلسلے میں ہز ہائی نس کی ساری گفتگو میری کتاب میں شامل ہے۔ میں خلوصِ نیت سے AKDN پر زور دیتا ہوں کہ وہ ان کو پڑھیں۔ عطاء آباد کے لینڈ سلائیڈ کے متاثرین کو ہیلی کاپٹرز سروس کی اشد ضرورت ہے۔

التت کے سکول میں جِسے ڈاکٹر شاہدہ جعفری نے گراں قدر عطیات دیے تھے، عطاء آباد اور سرٹ کے متاثرین کھیل کے میدان میں بچھی ہوئی کینوس پر بیٹھے ہوئے ہمیں ملے۔ میں اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ مجھے 1983 کا وہ وقت یاد آ گیا جب میں پہلی بار میں عطاء آباد اور سرٹ گیا تھا۔ شاہراہ قراقرم پر ایک رابطہ سڑک بنانے کے سلسلے میں AKRSP نے عطاء آباد کی VO کی معاونت کی تھی۔ یہ سڑک اس قدر عمودی تھی کہ میں جیپ سے اتر کر عطاء آباد کی طرف پیدل چل پڑا اور بلندی پر میں نے شاہین کے گھونسلے کی مانند مسحور کن گاؤں کو دیکھا۔ سرٹ میں AKRSP نے VO کی مالی معاونت کی تھی، جس سے VO نے مائیکرو ہائیڈل پاور پراجیکٹ مکمل کیا تھا، جو کہ شروع کے ایسے چند منصوبہ جات میں شامل تھا۔ VO کے ممبران نے دن کی روشنی میں بڑے فخر کے ساتھ مجھے یہ منصوبہ دکھایا تھا۔ انکی خوشی و مسرت اس وقت نہایت بے پایاں تھی۔

آج میں نے انہیں خواتین کے ہمراہ قیدیوں کی طرح محبوس پایا۔ انکی جنت اجڑ چکی تھی۔ ان کے آتش دان اور گھر، انکی فصلوں والی زمینیں اور باغات، انکا مال مویشی سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ انکی حالت ماہی بے آب جیسی تھی۔ انکے زخموں پر مزید نمک پاشی کے طور پر ایک دن پہلے حکومت نے انہیں چھ ماہ کے انتظار کے بعد، جس میں ان سے ہر طرح کے وعدے کیئے گئے تھے، مطلع کیا کہ فی گھرانہ ان کو چھ لاکھ کی سرکاری امداد دی جائے گی۔ گویا کہ یہ امداد زلزلہ کے متاثرین یا پنجاب اور دوسرے علاقوں میں لوگوں کو دی جانے والی امداد سے زیادہ ہو۔ لوگ صدمہ سے گنگ اور پریشان تھے۔ ان کا موازنہ دوسرے لوگوں سے کیسے کیا جا سکتا تھا جن کی زمین کا ایک ٹکڑا موجود تھا جہاں پر وہ سر چھپانے کا ٹھکانہ بنا سکتے تھے اور جن زمینوں کو کاشت کر کے وہ زندگی از سرِ نو شروع کر سکتے تھے۔ اس علاقہ میں ایک کنال کی قیمت ان کو دی جانے والی امداد سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔

خواتین مکمل طور پر تباہ حال ہو چکی تھیں۔ کئی مہینوں سے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے فارغ بیٹھی تھیں۔ وہ امید لگائے بیٹھی تھیں کہ ایک دن وہ واپس جائیں گی اور جا کر فصلیں اگائیں گی اور مال مویشی پالیں گی۔ وہ اس حد تک قنوطیت اور مایوسی کا شکار تھیں کہ انہوں نے یہ دھمکی دی کہ وہ معاوضہ میں دی جانے والی رقم کو قبول نہیں کریں گی۔ اور عطاء آباد سرٹ پر بنی ہوئی جھیل میں ڈوب مریں گی اور خدا کی جانب سے انکے مقدر میں لکھ دی جانے والی ہر سختی کو جھیلیں گی۔ میں ان سے صرف یہ وعدہ کر سکا کہ میں انکی آواز اور وسائل کو حکومت کے ان اعلیٰ ترین ایوانوں تک پہنچاؤں گا جہاں تک میری رسائی ہے۔ مجھے واحد تسکین تب حاصل ہوئی جب میں نے ان کو کچھ شیلٹر باکس عطیہ کئے۔ یہ شلٹر باکس NRSP کے CEO ڈاکٹر راشد باجوہ کی درخواست پر روٹری انٹرنیشنل نے عطیہ میں دیئے تھے۔ پاکستان برانچ نے لندن برانچ سے بذریعہ ہوائی جہاز 1,000 شلٹر باکس منگوائے تھے اور ایک شلٹر باکس پر 1,000 امریکی ڈالر لاگت آئی تھی۔

ہیلی کاپٹر عطاء آباد اور سرٹ کے اوپر اڑتا رہا جن کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا اور صرف وسیع و عریض لینڈ سلائیڈ کے آثار باقی رہے تھے۔ سرٹ کے آگے دریا کے ساتھ لارڈ کرزن کی "شادی کے کیک" جیسی یادگار تھی جو لارڈ کرزن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے 1903ء میں اسکی سلک روٹ آمد کی یاد میں بنائی گئی تھی۔ اس کا بھی کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ ہمارے نیچے پھیلی ہوئی گہرے رنگ کی جھیل نے پورے آئین آباد کو نگل لیا تھا اور صرف چند درختوں کے بالائی حصے نظر آ رہے تھے۔ اس نے پورے ششکٹ پائین اور بالا کے بھی کچھ علاقے کو غرقاب کر دیا تھا۔ ہم نے گلمت سکول میں لینڈ کیا۔ مجھے ششکٹ پُل (جو کہ شاہراہ قراقرم میں سب سے بڑا پُل تھا اور جس کے اب کوئی آثار باقی نہیں تھے) سے آگے جھیل میں سے ابھرتی ہوئی شاہراہ قراقرم کو دیکھ کر خوشی کا احساس ہوا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ 1974ء میں جب میں طارق صدیقی کے ساتھ اس علاقہ میں عارضی قیام کے لیے آیا تھا تو ششکٹ کے نزدیک شاہراہ قراقرم پر بنایا گیا پہلا "دوستی پُل" اُس وقت بھی ایک برفانی تودے کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا اور ہم نے کشتیوں کے عارضی پُل سے دریا پار کیا تھا۔ تاہم میری خوشی تھوڑی دیر کی تھی۔۔ چھوٹی سی کار جس نے ہمیں ہیلی پیڈ سے اُٹھایا تھا جلد ہی سلک روٹ ہوٹل پر پہنچ کر رُک گئی۔ یہ وہ ہوٹل تھا جہاں میں نے کئی مرتبہ قیام کیا تھا اور دورانِ سفر کھانے اور چائے کے لیے رکتا رہا تھا۔ پانی نے ڈائننگ ہال کو نگل لیا تھا۔ اور ہوٹل سے آگے شاہراہ قراقرم دوبارہ غائب تھی۔ سینکڑوں

مکانات، ہوٹل، دوکانیں حتٰی کہ گوز ومن آرگنائزیشن کا پھلدار درختوں کا باغ تک غرقاب ہو چکا تھا۔ میرے دوستوں متابعت شاہ اور قربان جان کے مکانات بھی تباہ ہو چکے تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں دیکھے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے 1983ء سے ان علاقوں کو بدلتے ہوئے دیکھا تھا۔لوگوں نے بے پناہ مشقت سے کام کرکے بہت کچھ پایا تھا اور آناً فاناً سب کچھ لٹ گیا تھا۔

میں ایک سو سے زائد مرد و خواتین کے اجتماع کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ سب مقامی LSOs گلمت، گوجال اور چپورسن کی نمائندگی کر رہے تھے۔ آخری دو LSOs کے نمائندے کشتی کے ذریعے یہاں پہنچے تھے۔ اسماعیلی ریجنل کونسل کے سیکرٹری ٹکہ خان بھی ہمارے ساتھ تھے۔ LSO کے نمائندوں نے AKRSP کے توسط سے اپنی اپنی کامیابیوں پر مختصراً بات کی اور لینڈ سلائیڈ کی وجہ سے درپیش مشکلات کا ذکر کیا:

- ☆ مقامی زرعی معیشت کو پہنچنے والا نقصان
- ☆ سیاحت کا خاتمہ
- ☆ تجارت میں نقصان
- ☆ چراہ گاہوں تک عدم رسائی
- ☆ جنگلات اور پھلدار پودوں کا نقصان
- ☆ ذرائع نقل و حمل میں تعطل
- ☆ ایندھن کی کمیابی
- ☆ قابلِ کاشت زمینوں کا نقصان
- ☆ لڑکوں اور لڑکیوں، بالخصوص لڑکیوں، کی تعلیم پر منفی اثرات
- ☆ ذرائع رسل و رسائل میں تعطل
- ☆ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ

ان لوگوں کا مطالبہ تھا کہ جھیل سے پانی کے اخراج کو تیز کیا جائے تاکہ انہیں مزید نقصانات سے بچایا جا سکے۔ تاہم اس ناگہانی آفت اور اس کے نتیجے میں جذباتی صدمہ کے باوجود انکے حوصلے بلند تھے اور وہ پُر یقین تھے کہ اس ابتلا کو مواقع میں بدل دیں گے۔

گلمت سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے واپسی کے دوران ہنزہ نگر کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ظفر وقار تاج بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ میں نے ان سے التجا کی کہ وہ حکومت کے اعلیٰ ایوانوں کو حالات کی سنگینی کا احساس دلائیں اور یہ کہ یہاں کے متاثرین کے حالات کا زلزلہ یا زیریں علاقوں کے متاثرین سے موازنہ نہ کریں۔ میں NDMA کے ایمرجنسی میں کی جانے والی کاروائی سے نہایت متاثر ہوا جنہوں نے علی آباد ہائی سکول مین ہیلی کاپٹر آپریشن بیس بنایا ہوا ہے اور فوج کے چار کپتان چوبیس گھنٹے سکول کی اس عمارت میں رہ کر جملہ سرگرمیوں کی نگرانی کرتے ہیں۔

گلگت میں مجھے AKRSP کے جنرل منیجر مسٹر اظہار ہنزئی نے آگاہ کیا کہ چیف سیکرٹری بابر یعقوب فتح محمد نے یقین دہانی کروائی ہے کہ وہ وفاق کی طرف سے دی جانے والی مقامی اور مخیّر اداروں کی امدادی رقوم سے بڑھ کر وسائل کا بندوبست کریں گے۔ میاں محمد نواز شریف نے دس کروڑ روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے ہنزہ کے ڈپٹی کمشنر نے آگاہ کیا کہ NDMA نے پہلے ہی بین الاقوامی امداد کی درخواست کر دی ہے۔ میں AKF جنیوا کے جنرل منیجر مسٹر ٹام کسنجر سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے دفتر کے ذرائع کو استعمال میں لاتے ہوئے عطا آباد کے بدقسمت متاثرین کے لیے مخیّر اداروں کی مدد حاصل کریں۔ عطاء آباد، سرٹ کے متاثرین 4 جنوری 2010ء سے بے خانماں ہیں اور یہی وقت ہے جب انہیں واضح طور پر بتایا جانا چاہیئے کہ ان کی بحالی کے کیا منصوبہ جات ہیں۔